اسلامی مُعاشرت میں نظامِ حکمرانی کی شناخت کا مسئلہ

ڈاکٹر محمد ریاض
اسسٹنٹ پروفیسر یونیورسٹی آف بلتستان (اسکردو)

Abstract

The identification of Islamic culture is obvious in today's world. The people and ruler of more than 50 states have been practicing the teachings of Islam. The presence of Muslims rulers and citizens actually indicates that the experiences of implementation of Islamic laws and regulation must be taken. For instance, the performance of worship,following the orders and openly expression of beliefs are real time example can be observed. Since the existence of Islamic state is justified, the another issue of formation of a system of governance is society comes after.

Despite the brightest example of political practice of Muhammad and later the Caliphate as the perfect political system, Muslims did not agree on single consolidated system. The process continues today, neither Muslim states look like of the Medina nor there is any example of same conduct of Caliphate in practice. Despite the clear signs of integrated political system in Quran, Sunnah and Companions, the contemporary Islamic states have their own political system. Some of them follow democracy, other enjoy dictatorship, most accepts monarchy, and rest kingdoms thus It is difficult to explain which of those political systems is best to practice that depicts the resemblance to the state of Medina and Caliphate. The study is an attempt to debt on the role of ruling in Islamic countres.

Key word:Caliphah,Caliphate,Islamic culture,Muslims rulers,Islamic law,political system,Quranic political system,Muslim states, democracy,

عصرِ حاضر میں اسلامی مُعاشرت کی نشاندہی کوئی مشکل اَمر نہیں۔ پچاس (۵۰) سے زائد ریاستیں ایسی ہیں جہاں حکمران اور رعایا کی اکثریت دینِ اسلام سے وابستہ ہے۔ مسلمان حاکم اور مسلمان رعایا کی موجودگی دراصل اس بات کی دلیل ہے کہ متعلقہ ریاست میں اسلامی شرع وقوانین پر عملدرآمد کے تجربات یقیناً ہوتے ہوں گے۔ جیسا کہ ان ریاستوں میں عبادات کی انجام دہی، احکامات کی پیروی اور عقائد کی کھلم کھلا اظہارِ رائے کی آزادی وغیرہ جیسے اُمور بخوبی مشاہدہ کئے جاسکتے ہیں۔ لہٰذا اسلامی مُعاشرت کے یقینی وجود کے بعد سب سے اہم اور ضروری مسئلہ اس مُعاشرت میں نظامِ حکمرانی کا قیام ہے۔ پیغمبر اسلامؐ کے سیاسی طرزِ عمل کی روشن ترین مثالیں اور بعد ازاں خلافت جیسے کامل ترین سیاسی نظام کی موجودگی بھی بعد کے مسلمانوں کو یکجہتی نظام پر متفق نہ کرسکی۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے کہ مسلمان ریاستوں میں مدینہ کی ریاست جیسی شبیہ نظر آتی ہے اور نہ ہی خلافت جیسے طرزِ عمل کی کوئی مثال ملتی ہے۔ قرآن وسنت، اہلبیتِ عظام اور صحابہ کرام کی سیرت میں یکجہتی نظامِ سیاسی کے واضح اشارات کے باوجود معاصر اسلامی ریاستوں میں الگ الگ سیاسی نظام رائج ہیں۔ کہیں جمہوریت ہے تو کہیں آمریت ہے، یہ واضح کرنا مشکل ہے کہ ان میں سے کون سا نظام بہتر ہے جو مدینہ کی شہری ریاست کے قریب بھی ہو اور خلافت کی نیابت بھی کر سکے۔ زیرِ نظر مقالہ میں جدید اسلامی مُعاشرت میں رائج طرزِ حکمرانی کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

عصری دنیا میں ستاون ۵۷ ممالک ایسے ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں بستے ہیں۔ البتہ ان ممالک میں نظامِ حکومت و نظامِ ریاست الگ الگ ہونے کے باوجود بظاہر دینی معاملات (جن کا دائرہ کار کم وبیش تین عقائد توحید، رسالت اور قرآن تک محدود ہوسکتا ہے) ایک ہی طرح کے رائج ہیں۔ تمام مسلمان اللہ کو یکتا مانتے ہیں، پیغمبر اسلامؐ کو آخری نبی جب کہ دینی ودنیاوی احکامات پر مشتمل کتاب قرآن مجید کو اللہ کی طرف سے نازل کردہ آخری کتاب سمجھتے ہیں۔ ان تین مشترکات پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہ یکسانیت دراصل ایک مکمل اسلامی وسماجی زندگی کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا آغاز آج سے چودہ سو سال قبل اللہ کے نبیؐ نے کیا تھا۔ مدینہ کی شہری ریاست اور آج کی مسلم ریاستوں میں بنیادی فرق احکامات وعبادات کے اعتبار سے نہیں بلکہ قوانین وضوابط کے نفاذ کے اعتبار سے ہے۔ آج کی ہر مسلمان ریاست سمجھتی ہے کہ ان کے قوانین مدینہ کی اسلامی ریاست کے اُصول سے مستعار لیے گئے ہیں۔ حالاں کہ مشاہدہ ہمارے سامنے ہے کہ آج کی مسلم ریاستوں میں چند بنیادی اُصول (جن کی نشاندہی ہم نے گفتگو کے آغاز میں کی ہے) کے سوا دیگر تمام اُمورِ مملکت جدا جدا ہیں۔ نہ صرف جداگانہ قوانین لاگو ہیں بلکہ طرزِ زندگی، طرزِ تعلیم اور طرزِ معاشرت بھی مختلف ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تمام ریاستیں خود کو مدینہ کی شہری ریاست کی پیروکار سمجھتی ہیں۔ شرعی قوانین کا اِطلاقی جواز بھی اُسی ریاست سے وابستہ قرار دیتی ہیں۔ جب کہ جمہوریت ہو کہ آمریت یا بادشاہت ہر سہ صورت کا لازمی جواز بھی اُسی مدینہ کی ریاست میں

ڈھونڈا جاتا ہے۔ اصل مُدعا کی طرف جانے سے قبل ہم یہاں عصری دُنیا کی اسلامی ریاستوں میں رائج نظامِ حکمرانی کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمان ریاستوں میں مختلف قسم کے نظام ہائے سیاسی رائج ہونے کے باوجود تمام اسلامی ریاستیں خود کو مدینہ کی شہری ریاست سے منسوب سمجھتی ہیں تو اس کے پسِ پردہ قرآنی آیات ہیں جن کے مفاہیم (بقول مسلمان مفکرین) نظامِ حکمرانی کی نشاندہی کرتے ہیں۔

چوں کہ قرآنی تعلیمات اور پیغمبر اسلامؐ کے فرامین سے یہ جواز تلاش کیا گیا ہے اس لیے سیاسی نظام کسی بھی طریقہ کار کے تحت ہو، عوامی فلاح و بہبود کے لیے ہونا چاہیے۔ البتہ یہ واضح رہے کہ سیاسی نظام جمہوری ہو، آمریت ہو یا بادشاہت تینوں صورتوں میں مشاورتی عمل کو ایک خاص قسم کا تفوّق حاصل رہا ہے اور قرآنی مصداق کے مطابق یہ حکم پیغمبر اسلامؐ کیلئے تھا اس لئے ایک اُمتی (مسلمان) کے لیے بطریق اولیٰ اس (مشاورت) پر عمل کرنا اور بھی ضروری ہے۔ ایک طرح سے نظریہ مشاورت کے چھتری تلے اور عدل و انصاف کی فراہمی کے جواز میں، ظلم و استبداد کی بیخ کنی جیسے نظریات کے تحت کوئی بھی نظامِ حاکمیت قائم کیا جا سکتا ہے۔ اسی نظریئے کے تحت کہ مشاورتی عمل کا فی الواقعہ وجود حاکمیت کی راہ متعین کرتا ہے تو پھر نظام کسی بھی طرح کا ہو حاکم و محکوم دونوں کی شناخت وضع ہو جاتی ہے، دوطرفہ ذمہ داریوں کا تعین ہو جاتا ہے اور ریاستی نظام کی اصل روح جس کا تعلق عوام کی فلاح و بہبود سے ہے، نکل کر سامنے آجاتا ہے۔ گویا کسی خاص شکل کی وضاحت کے بجائے مطلق حاکمیت کی نشاندہی کی گئی ہے لہٰذا موجودہ دنیا کی تمام اسلامی ریاستوں میں رائج سیاسی نظام کو ایک ہی نظام سے نسبت دینے کے بجائے عمومیت کے عنوان سے قبول کرنا ہوگا۔ یہاں پر اس نکتے کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ قرآن کا بیان کردہ قاعدہ کلیہ حاکمیت کی نشاندہی تو ضرور کرتا ہے، البتہ اس کی ماہیت و ہیئت خود انسانوں کی فہم و عقل پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں مشاورت اور اطاعتِ امیر کا حکم ہے۔ دونوں حکموں کی اس تصدیق کے بعد کہ نظامِ زندگی میں تسلسل کے لیے کسی کا حاکم بننا ضروری ہے تو پھر یقینی طور پر اُصولِ حکمرانی بھی وضع ہوئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں نشاندہی کی کہ مشاورت اسلامی سیاست کا سب سے اہم اور بنیادی اُصول ہے۔ اسلامی مُعاشرت میں مشاورتی عمل نہ صرف سیاسی معاملات میں رائج ہے بلکہ دینی معاملات میں بھی مشاورت اور اجتماعیت جو مشاورت کی صامت صورت ہے، کو بڑا دخل ہے۔ لہٰذا آج کی مسلم ریاستوں میں ہم مطلق العنانیت، شخصی حکمرانی (آمریت)، جمہوریت جیسی قسمیں مشاہدہ کرتے ہیں۔ ذیل میں ہم اسلامی مملکتوں میں رائج طرزِ حکمرانی کی نشاندہی کرتے ہیں اور بعدازاں ایک تفصیلی بحث کی صورت میں اس امر کی وضاحت کرتے ہیں کہ اسلامی تاریخ میں جمہوریت جیسے جدید نظامِ سیاسی کو بہت کم ہی پذیرائی ملی ہے جب کہ دیگر دو نظام ہائے سیاسی کے مشاہدات اچھی وضع قطع میں بھی دیکھے گئے۔[۲] جب کہ امیر و امام کی اطاعت کے نام پر بُری مثال کی حکومتیں و سلطنتیں بھی دیکھی گئیں۔[۳] آج بھی

مسلم دنیا میں ان بُری سلطنتوں اور حکومتوں کی باقیات آمریت وشہنشاہیت کی صورت میں موجود ہیں۔عصری دُنیا میں مسلم اُمہ تین معروف نظامِ سیاسی کے تحت زندگی گزار رہی ہے، اول، جمہوری نظام، دوم، شاہی نظام، سوم، آمرانہ نظام۔

سطور بالا میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ الگ الگ سیاسی نظام کی موجودگی کے باوجود ہر ریاست کا دعویٰ ہے کہ وہ مدینہ کی شہری ریاست کی پیروکار ہے اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ مسلمان قوم کی جمہوریت سے شناسائی بہت زیادہ پرانی نہیں ہے، چودہ سو سالہ تاریخ میں امیر کی اطاعت (جس کی نشاندہی اچھی اور بُری دونوں صورتوں میں کی جاسکتی ہے) کا جذبہ ہی دیکھا گیا۔البتہ یہ بات محلِ نظر ہے کہ خلافتِ راشدہ کے بعد قائم اسلامی حکومتوں کو مثالی یا شورائی نظام کے تحت معرضِ وجود میں آنے والی حکومتیں کہہ سکتے ہیں یا نہیں۔بعض مسلمان مفکرین ؎ کے نزدیک یہ تمام حکومتیں بھی دراصل خلافتِ راشدہ سے مُستعار لی گئیں تھیں۔اگر چہ ان ادوار میں شورائیت سے صَرف نظر کیا گیا اور ملوکیت کی بنیاد رکھی گئی جب کہ بعض حکمرانوں سے غیر شرعی وغیر اخلاقی سرگرمیاں بھی سرزد ہوئیں۔ان تمام خامیوں کے باوجود مجموعی طور پر فتوحات وایجادات اور ملکی امن وامان جیسے عنوانات مستحکم سیاسی نظام کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔جب کہ ان کوتاہیوں کے باوجود ان نظاموں کو اسلامی قرار دینا اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہاں کے حکمران مسلم اُمہ کے امیر کے فرائض انجام دیتے تھے۔اسی ایک موقف یعنی اسلام میں امیر کا حکم تعبُّدی حیثیت رکھتا ہے، کے نتیجے میں حاکمیت (سیاست) کے دو نظام وضع ہوئے۔ایک خلافت سے موسوم ہوا جس کی توثیق قرآن سے کی جاتی ہے جب کہ دوسرا نظام ملوکیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔جب کہ ان دونوں کی کوکھ سے ایک تیسرے نظام نے جنم لیا جس کو آج کی اصطلاح میں جمہوریت کہتے ہیں۔تاویلات وتعبیرات کے محتاج ہوئے بغیر ہم صرف دلیلِ نقلی پر بھروسہ کریں تو ان تینوں نظام کی مخالفت میں کوئی واضح ثبوت میسر نہیں۔اسلامی تعلیمات میں صرف امیر کی اطاعت کا حکم ہوا ہے اور امیر کا انتخاب باہمی مشاورت پر منحصر قرار دیا گیا ہے لہٰذا جو بھی شخص، چاہے اس کا انتخاب آج کی جدید اصطلاح میں جمہوری طریقے سے ہو، آمر ہو یا بادشاہ اگر تو وہ معاشرتی اصلاح کو بخوبی انجام دے سکتا ہو، ظلم واستبداد کی بیخ کنی کر سکتا ہو اور عوامی فلاح وبہبود کی دیکھ بھال اچھی طرح کر سکتا ہو، وہ حاکم بننے کا یقینی حق رکھتا ہے۔اس سلسلے میں بعض اسلامی مفکرین نے شریعت سے جواز بھی نکال لیا ہے۔ان کے نزدیک شریعتِ اسلام میں فی نفسہ بادشاہت (جو مطلق العانیت کی مکمل تشریح ہے اور عصری دُنیا میں رائج آمریت اسی کی ذیلی شاخ کے طور پر معروف ہے) کی مذمت نہیں کی گئی اور نہ ہی کسی فرد کو بادشاہت کی ذمہ داری اُٹھانے سے منع کیا گیا ہے اگر حکومت حاصل ہو جائے اور بالفرض ایک ہی شخص ملک پر قابض ہو جائے وہ اسے صحیح طریقے سے چلائے اور حق وصداقت کی راہیں نہ چھوڑے تو اس قسم کی حکومت میں کوئی بُرائی نہیں۔۵ امامت بمنزل حکم کے ہے اور حکم تو ایک شخص کا ہی نافذ ہوتا ہے۔٦ یعنی بادشاہ ہو یا آمر اگر وہ حکم نافذ کرنے کی استعداد رکھتا ہو تو وہ نظامِ حکمرانی چلا سکتا ہے اور اس کی اطاعت اُمت پر فرض

ہو جاتی ہے۔ہم دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے بعد جو خلافت کا نظام قائم ہوا اس میں اسی قانون کہ اطاعتِ امیر فرض ہے، کو فوقیت دی گئی۔البتہ اطاعت کے جواز کو قرآنی حکم کے مطابق مشاورت جیسے بنیادی اُصول سے ثابت کیا گیا۔اس عمل کے ذریعے ایک طرف قرآن کے نظریہ سیاسی کی عملی تفسیر کی گئی تو دوسری طرف آئندہ آنے والی زندگی کے لیے اسلامی قانونِ سیاست کا نظام بھی وضع ہوا۔چوں کہ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ کے مطابق خلافتِ راشدہ کا نظام اسلامی اُصولوں کے مطابق قائم ہوا لہٰذا ہم اس نظام کو مسلمانوں کے لیے نمونہ قرار دیتے ہوئے یہ وضاحت ضرور کریں گے کہ خلافت کے بعد قائم ہونے والا نظامِ ملوکیت (جس نے بعد میں سلطنت کا رُوپ دھار لیا) بھی دراصل اسلامی مملکت کا ایک تسلسل تھا۔

معروف مصری محقق امین مصری نے خلافت وملوکیت کے اس اِکائی عمل کو یوں بیان کیا ہے: ''اسلامی مملکت ابتدائی ایام سے ہی طبعی حالات میں منتقل ہوتی چلی آ رہی تھی۔ایک حالت ختم ہوتی تھی اور دوسری کیفیت شروع ہو جاتی تھی، وہ ابتداً اس کیفیت سے جس پر خانہ بدوشانہ طرزِ زندگی غالب تھا ایک گونہ مدنیت کی کیفیت میں منتقل ہوئی اس کے بعد اس سے زیادہ ترقی یافتہ مدنیت میں منتقل ہوئی اور اس طرح تدریجی طور پر وہ برابر آگے بڑھتی چلی گئی۔''[۷] امین مصری کی نظر میں اسلامی سیاسی نظام اپنے آغاز (پیغمبر اسلامؐ کے بعد) سے ہی اِرتقائی صلاحیت رکھتا تھا۔خلافتِ راشدہ کے بعد اگرچہ اس کی ہیئتِ اجتماعی میں کافی تبدیلی آئی تاہم مدنیّت کے اعتبار سے مسلسل اِرتقاء کا ظہور ہوا۔گویا اسلامی تاریخ میں سیاسی گوشہ ہمیشہ تفوّق پر رہا۔پیغمبر اسلامؐ چونکہ اسلامی ریاست کی بنیاد فراہم کر گئے تھے اور خلفائے راشدین نے اس بنیاد پر پوری عمارت کھڑی کر دی تھی لہٰذا بعد کے ادوار میں اگر تھوڑی بہت تبدیلی ہوئی بھی تو یہ دینی اعتبار سے کمی بیشی کہہ سکتے ہیں تاہم سیاسی نقطہ نظر سے نقائص تلاش کرنا شاید ممکن نہیں۔اس لیے یہ کہنا مبنی بر واقعہ ہوگا کہ اسلامی تاریخ کا سیاسی گوشہ خلافت جیسے بنیادی ستون کی وجہ سے ہمیشہ بلند رہا۔اگر ہم دینی معاملات کی تشریح اور ایک حکمران کے لیے اس پر عمل پیرا ہونے کے ضروری اَمر سے صَرفِ نظر کریں تو سیاست جس کا آغاز خلافت سے ہوا تھا، ملوکیتی شکل میں نمایاں رہی۔شوریٰ سے درگزر کرتے ہوئے وراثتی عمل کا رجحان بڑھا، یوں اسلامی سیاسی نظام جو شروعاتی دور میں مشاورت پر مبنی تھا موروثی و ملوکیتی شکل میں تبدیل ہو گیا۔جدید زمانے کی سیاسی ہیئت جو مسلم اُمہ کے ہاں رائج ہے، کو اگر خلافت وملوکیت وموروثیت جیسے مناہج سے تطابق کریں تو اصطلاحی تفریق یقیناً نظر آتی ہے تاہم بنیادی حیثیت زیادہ متفرّق نہیں ہے۔جمہوریت کو ہم شورائی نظام سے تشبیہ دے کر اس کے جواز کا حل ڈھونڈ سکتے ہیں جب کہ شہنشاہیت یا آمریت جیسے موارد کو ہم ملوکیت سے تشبیہ دیتے ہوئے اس کے رواج کو حاکمِ وقت کی اطاعت سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔جیسا کہ مسلم معاشرے کی طویل تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔اب جب کہ جدید دُنیا نے جس طرح دیگر شعبہ ہائے زندگی میں نت نئے اُصول وضع کیے ہیں اسی طرح سیاست کو بھی نئے رُوپ پہنا دیئے ہیں تو پھر مسلمانوں کے ہاں بھی اس طرزِ عمل کی نئی تشریح ہونی چاہیے۔پہلے دائرہ

کا رشوریٰ تک محدود تھا پھر یہ عمل سکڑ کر یکجہتی نظام کا پرتُو بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یکجہتی نظام کے واضح نظائر نہ ہونے کے عمل نے مسلم اُمہ کو تین مختلف قسم کے سیاسی نظریات کی طرف ملتفت کر دیا۔ آج عصری دُنیا کے مسلم معاشرے میں شوریٰ طرز کا نظام بھی رائج ہے جس کی مثال جمہوری ریاستیں ہیں، انفرادی حیثیت کا طرزِ حکمرانی بھی دیکھا جاسکتا ہے اس کی مثال عرب ریاستوں میں ہمیں نظر آتی ہیں اور مطلق العنانیت بھی عام ہے جیسا کہ ماضی قریب میں پاکستان اس عمل سے بار بار گزرا ہے اور اب بھی بعض عرب ممالک میں یہ نظام رائج ہے۔ لہٰذا شورائی نظام سے ہوتے ہوئے جمہوری طرزِ عمل کی طرف مسلسل اِرتقائی سفر مسلمانوں کے ہاں سیاسی بالغ نظری کی روشن ترین مثال ہے۔

جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا کہ مسلم اُمہ کے ہاں رائج مختلف قسم کے سیاسی نظریات کے پس پردہ قرآنی آیات ہیں۔ موقف کی مزید وضاحت کے لیے ہم یہاں پر چند آیات اور احادیث درج کیے دیتے ہیں۔ مسلمان مفکرین امیر کی اطاعت کو عام طور پر قرآن کی مندرجہ ذیل آیتوں سے نسبت دیتے ہیں:

يَـا اَيُّهَـا الَّذِيْنَ اٰمَنُواْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُواْ الرَّسُولَ وَ اُوْلِى الْاَمرِ مِنْكُمْ ...۸ (اے ایمان والو! اللہ اور رسول اور اپنے میں سے فرمانرواؤں کی تابعداری کرو)۔

یہ تو طے ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کا تعلق اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت سے ہے۔ اگر ماسبق دونوں اطاعتوں سے منہ موڑ کر صرف حاکمِ وقت کی اطاعت کو اپنے اوپر لازم قرار دیا جائے تو یہ قرینِ عقل نہ ہوگا۔ بلکہ دینی و سیاسی دونوں اعتبار سے حکمِ شرع کی خلاف ورزی ہوگی۔ لہٰذا ایک حاکم کی اطاعت کو صرف اُسی صورت مبنی برحق تسلیم کرنا ہوگا جب وہ دینی اعتبار سے بھی لائقِ تعظیم نظر آئے۔ لیکن مسلم دانشوروں نے ''اُولی الامر'' کو وسیع معنوں میں استعمال کیا ہے۔ بعض کے نزدیک حاکمِ وقت برا ہو یا اچھا، دونوں صورتوں میں اس کی اطاعت لازمی ہے۔۹ چوں کہ تنظیمِ معاشرہ اجتماعیت واطاعت کی محتاج ہے اور یہ اجتماعیت باہمی اتفاق واتحاد اور امیر کی نگرانی میں ہی قائم ہوسکتی ہے۔ ایک حاکم کے اپنے بُرے اعمال خود اُس کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔ خدا کے حضور وہ خود اپنے حساب کا ذمہ دار ہوگا لیکن رعایا کی ذمہ داری اُس امیر کی ہر حال میں اطاعت پر منحصر ہے۔ اگر وہ معصیت میں مبتلا ہوتا ہے تو رعایا کی ذمہ داری صبر ہے، اگر وہ معصیت سے پرہیز کرتا ہے تو معاشرتی نظم ونسق میں مضبوطی کے ساتھ حاکم و رعایا دونوں جزاء کے مستحق ٹھہریں گے۔ اسلامی تاریخ میں نظریہ سیاسی کی یہ عمومی مثال ہے۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی تاریخ میں ''اولی الامر'' کی اصطلاح کو دینی مقاصد سے زیادہ سیاسی مقاصد کیلئے استعمال کیا گیا۔ عوامی اذہان اس بات پر آمادہ نظر آئے کہ اطاعتِ امیر کا فریضہ بخیر خوبی انجام پائے قطع نظر اس کے کہ حاکمِ وقت دینی واخلاقی اعتبار سے کمزور ترین کیوں نہ ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ صاحبِ امر کی اطاعت کو بھی بیان کیا گیا ہے تو پھر جب اللہ اور اُس

کے رسول معصیت سے پاک ہیں اور وہ صرف انہی اوامر کی نشاندہی کرتے ہیں جو انسانیت کے لیے فائدہ مند ہوں اور اُن نقائص سے اجتناب کا حکم دیتے ہیں جو انسانیت کے لیے ضَرر رہوں۔ پھر کیسے ممکن ہے کہ ان ذواتِ مقدسہ کی پیروی کرنے والا اور نیابت کے فرائض انجام دینے والا سیاسی طور پر تو ان کا پیروکار بنے اور دینی معاملات میں پیروی کا خیال نہ رکھے؟ اطاعت کا اطلاق اخلاقیات سے لے کر عبادات تک اور سماجی معاملات سے لے کر سیاسیات تک کے تمام موضوعات پر ہونا چاہیے۔ وگرنہ اطاعت ناقص اور مجہول قرار پائے گی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اکثر حکمرانوں کی طرف سے اِن اُمور کا خیال نہیں رکھا گیا۔ صرف سیاسی اُمور کی طرف توجہ نہ دی گئی اور اس بات کو زیادہ اُچھالا گیا کہ حاکمِ وقت کی اطاعت دراصل خدا اور رسول کی اطاعت ہی ہے۔ اسی ضمن میں ایک حدیث بھی پیغمبر اسلامؐ سے منسوب ہے جس میں آپؐ نے فرمایا: ''جس نے میری اطاعت کی اُس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔''۱۰

اس حدیث میں پیغمبر اسلامؐ نے امیر (حاکم) کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا ہے اور ان کی نافرمانی کو خود کی نافرمانی قرار دیا ہے۔ ہم اُولی الامر کی اطاعت کو مطلق اطاعت پر محمول کرنے کے بجائے چند اجزاء سے مشروط کرتے ہیں:

☆ پیغمبر اسلامؐ اچھائی کا نمونہ تھے اس لئے اسلامی ریاست کے حاکم کو بھی اس صفت سے متصف ہونا چاہیے اور اچھائی اور بُرائی جیسی صفات کی الگ الگ شناخت کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

☆ پیغمبر اسلامؐ بعثت سے قبل صادق و امین سے معروف ہوئے اور بعثت کے بعد رحمت العالمین سے ملقب ہوئے، حاکمِ وقت کو بھی صداقت و امانت کا بھرپور خیال رکھنا چاہیے اور رعایا پر رحم دل واقع ہونا چاہیے۔

☆ پیغمبر اسلامؐ نے پوری زندگی اطاعتِ خدا میں صرف کی جبکہ اسلامی ریاست کے حاکم کو آپؐ کی اطاعت میں اپنی زندگی صَرف کرنی چاہیے، یعنی دینی و سیاسی تمام اُمور میں اطاعت دراصل ایک حاکم کو حکمرانی کا جواز بھی اطاعت کرتی ہے اور شرعی قوانین کے نفاذ میں بھی معاون بنتی ہے۔

☆ پیغمبر اسلامؐ دین کی تبلیغ کے لیے معمور تھے اور یہ عمل آپؐ نے بخیر خوبی انجام دیا۔ اسلامی ریاست کے حاکم کو دین کی حفاظت پر مخلص ہونا چاہیے تاکہ جس دین کی تبلیغ پیغمبر اسلامؐ نے مشقتوں اور محنتوں سے کی تھی اس کی حفاظت یقینی ہو۔

☆ پیغمبر اسلامؐ نے مدینہ کی ریاست کو فلاحی مملکت کے طور پر متعارف کرایا۔ مسلمان اور غیر مسلمان دونوں قسم کے انسان کو برابری کی بنیاد پر رہنے کی اجازت دے دی، ایک مسلم ریاست میں حاکمِ وقت کو بھی انہی موارد کا خیال رکھنا چاہیے۔

☆ پیغمبر اسلامؐ نے قرآنی حکم کے مطابق اپنے اِردگرد موجود لوگوں سے مشاورت جاری رکھی اور ریاستی اُمور کی انجام دہی میں وقتاً فوقتاً اپنے ساتھیوں سے مدد لیتے رہے۔ اگرچہ آپؐ کا یہ عمل ''مجبوری تھی یا مشکلات تھیں'' جیسی اصطلاحوں کا محتاج

نہ تھا تاہم دنیاوی زندگی کو رونق بخشنے اور ریاستی نظم وضبط کی تکمیل کیلئے اپنے ساتھیوں کو ریاستی اُمور میں شریک بنالیا۔ایک مسلمان ریاست کے حاکم کو بھی مشاورت جیسے اہم اُصول کو پیشِ نگاہ رکھنا چاہیے، جب کہ معاونین کی ضرورت تو ہر حال میں رہے گی۔لہٰذا سیاسی بالغ نظری کا نظارہ اُسی وقت دیکھا جاسکتا ہے جب ایک حاکم مشاورتی عمل جاری رکھے جب کہ معاونت کا بھی محتاج ہو۔

یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر صرف اچھی حاکمیت کی صلاحیت ہی کسی شخص کو مسلم اُمہ کا حاکم بننے کا جواز فراہم کرتی ہے تو پھر موجودہ نظامِ جمہوریت کے تحت منتخب ہونے والے افراد میں کیا بُرائی ہے؟ بلکہ یہ تو زیادہ قابلِ وثوق اور جدید تقاضوں کے مطابق بھی ہے جس کے تحت حاکم کے انتخاب میں براہِ راست عوام کی شمولیت ہوتی ہے ایک طرح سے عوام کی رضا مندی اس عمل کے انجام دہی میں اہم نکتہ ثابت ہوتی ہے۔لیکن چوں کہ اہل علم حضرات کے نزدیک ہر عام وخاص کے لیے یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ حاکمِ وقت کے انتخاب میں حصہ دار بن سکے بلکہ یہ عمل چند اہل رائے حضرات ہی انجام دے سکتے ہیں جن کے مجموعہ کو شوریٰ کا نام دیا جاتا ہے۔ یہاں پر یہ اعتراض بھی وارد ہوتا ہے کہ خلافت جیسے مبادی اُمور کیلئے تو اہل علم حضرات کی رائے ہر حال میں ضروری ہے لیکن اگر خلافت کے بعد اور موجودہ زمانے میں جمہوریت جیسے نظام کو قبول کرنے کی گنجائش ہے تو پھر عوام کی شمولیت کو ناقابل عمل سمجھنا ممکن ہو سکے گا؟ اس حال میں کہ اگر ریاستی مشنری جمہوریت جیسے جدید نظام سے تشکیل پاسکتی ہے تو اس میں قباحت کیا ہے؟ بلاتفریق ہر حاکم کی اطاعت ضروری اور واجب الامر ہے تو پھر جمہوری طریقے سے منتخب ہونے والا حاکم بھی امیر کا درجہ ہی رکھتا ہے جس کا براہِ راست انتخاب عوامی رائے دہی سے ہوتا ہے۔

قرآن مجید کی ایک دوسری آیت میں اجتماعی ذمہ داریوں کی ادائیگی اہل افراد کے کاندھوں پر رکھی گئی ہے:اِنَّ اللّٰہَ یَا مُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوْا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا وَ اِذَا حَکَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْکُمُوْا بِالْعَدْلِ .:الٰ ’’بے شک اللہ تم کو فرماتا ہے کہ پہنچادو امانتیں امانت والوں کو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو فیصلہ کرو انصاف سے۔‘‘

اس آیت میں تین نکات توجہ کے حامل ہیں، حکم کی نوعیت عمومی ہے یعنی ہر مسلمان اس امر کا پابند ہے کہ وہ اجتماعی ذمہ داریوں کا احساس کرے، اہل افراد ان ذمہ داریوں کو اُٹھانے کے پابند ہوں گے، شریعتِ اسلام کے تحت انصاف کے تقاضے پورے کئے جائیں۔ دیکھا جائے تو اس آیت میں بھی سیاسی پہلو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے۔ چوں کہ دینی معاملات کے علاوہ کچھ معاشرتی ذمہ داریوں کا وجود بہر حال موجود ہوتا ہے اور ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کا تعلق اجتماعیت و ادائیگی سے ہے۔

اسلام کے ابتدائی ایام میں تو یہ ذمہ داری پیغمبرِ اسلامؐ کے کاندھوں پر تھی لیکن آپؐ کے بعد اجتماعی ذمہ داری کا

تعلق ایک فرد کے بجائے گروہ میں منقسم ہوا۔لیکن اس گروہ کو بھی آخر کار ایک ہی فرد کی صلاحیت ولیاقت پرکھ کر اُس کا انتخاب کرنا تھا تاکہ وہ مسلم معاشرتی وسیاسی عمل کو مزید آگے بڑھا سکے۔ یہ انتخاب جس کا تعلق دینی وسیاسی دونوں طرح کے پہلوؤں سے تھا، دراصل اطاعت کی تکمیلی شکل ہی تھی۔ جیسا کہ انبیاء ومرسلین اکثر و بیشتر اس جانب دعوت دیتے رہے ہیں۔''فَـاتَّـقُـوْا الـلّـٰهَ وَ أَطِيْعُوْن [۱۲] لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت اختیار کرلو'' اگر چہ یہ اطاعت براہِ راست پیغمبرانِ خدا سے تعلق رکھتی ہے لیکن اب چوں کہ پیغمبرانِ خدا دنیا میں نہیں ہیں تو پھر اس کا مصداق کون ہوگا؟ اس سوال کا جواب آنحضرتؐ کی وہ حدیث ہوسکتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ علماء وارثِ انبیاء ہیں۔[۱۳] دراصل اسلامی تاریخ میں علماء مخصوص علم (علمِ دین خاص کر قرآنیات، فقہی واُصول مفاہیم) حاصل کرنے والے افراد کو ہی کہا گیا حالاں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرونِ وسطیٰ میں مسلمان علماء نہ صرف دینی علوم پر عبور رکھتے تھے بلکہ سائنسی کمالات بھی ان کے دسترس میں ہوتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مذکورہ آیت میں اطاعت سے مراد دراصل اطاعتِ دینی ہی مراد ہے یعنی اللہ کے رسول حکمِ خدا سے اطاعتِ خدا کی طرف دعوت دیتے تھے، احکاماتِ الٰہی کی تبلیغ کرتے تھے اور انسانوں کو گمراہ کُن راہوں سے نجات دلا کر روشن تر راہوں پر لگا دیتے تھے۔ یہ پیغمبرانِ خدا کی اولین ذمہ داری تھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان انبیاء کی موجودگی میں کسی فرد کو نظامِ سیاسی کو اپنے ہاتھ میں لینے کی اجازت تھی؟ یا خدا کی طرف سے متعین کردہ نبیوں کی ذمہ داری فقط تبلیغات وترسیلات کی حد تک تھی کہ وہ بس پہنچانے کے عمل کے ذمہ دار ہیں باقی دنیاوی اُمور میں کوئی رائے نہیں رکھتے؟ اصل میں ساری مشکل یہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اگر ہم پیغمبرانِ خدا کی زندگی کو دو الگ الگ حصّوں میں تقسیم کریں تو پھر سیاسی نظام کی تشکیل میں ہماری کامیابی نہ ہونے کے برابر ہوگی جیسا کہ تین مختلف قسم کے سیاسی نظریات کی موجودگی اس بات کا کُھلا ثبوت ہے۔ ایک مضبوط سیاسی نظام کی تشکیل کیلئے پیغمبرانِ خدا کی جدو جہد کو یک رُخی حیثیت میں بیان کرنی ہوگی۔ وہ ایک طرف خدائی احکام کی ترسیل پر مامور تھے تو وہی دوسری طرف دنیاوی اُمور میں بھی حکمِ آخر کا درجہ رکھتے تھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے برگزیدہ انبیاء میں سے کئی ایک نے رسالت کے فرائض کے ساتھ ریاست کی تشکیل کا فریضہ بھی انجام دیا۔

حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت محمدؐ نے معتبر اور عوامی وفلاحی ریاستیں قائم کیں۔ پیغمبر اسلامؐ سے منسوب مذکورہ بالا دونوں حدیثوں ''علماء وارث، انبیاء ہیں اور بنی اسرائیل کے نبیوں جیسے ہیں'' کی تطبیق دو طرح سے ہوسکتی ہیں: اول یہ کہ ایک معتبر عالم دین جس کی معلومات دینی و دنیاوی دونوں طرح سے کامل ہوں، حاکم کا حق رکھتا ہے۔ دوسری یہ کہ علماء کی ایک کمیٹی تشکیل ہو جس میں مقتدر علمی شخصیات شامل ہوں جس کو عُرفِ عام میں شوریٰ بھی کہا جاتا ہے، وہ حکومت کی تشکیل اور ہیئت میں کردار ادا کرے۔ قرآنی مفاہیم اور اقوالِ پیغمبرِ اکرمؐ کی روشنی میں یہ

نتیجہ دیا جا سکتا ہے کہ حکومت کا حق فردِ واحد کو ہی حاصل ہوگا تاہم کچھ شرائط کی بنیاد پر یہ حق تفویض ہوسکتا ہے جیسا کہ سطور بالا میں اِن شرائط کی طرف اشارہ کیا گیا۔ ہم نے قرآن مجید کی صرف تین آیات کا تذکرہ کیا جن سے عام طور پر امیر کی اطاعت کا معنی عمومی لیا گیا ہے یعنی خلافت، ملوکیت، موروثیت تین طرح کے مفاہیم اخذ کئے گئے۔ اب احادیثِ پیغمبرؐ سے چند مفاہیم بیان کر کے موضوعِ بحث کو سمیٹ لیتے ہیں۔ اطاعتِ امیر کے حوالے سے پیغمبر اسلامؐ سے متعدد احادیث منسوب ہیں۔

مثلاً آپؐ نے فرمایا: ''**انہ ستکون امراء بعدی یصلون الصلاۃ لوقتھا و یوخرون عن وقتھا فصلوھا معھم فان صلوھا لوقتھا و صلیتموھا معھم فلکم و لھم، ان اخروھا عن وقتھا فصلیتموھا معھم فلکم و علیھم، من فارق الجماعۃ مات میتۃ جاھلیۃ و من نکث العھد و ممات ناکثا للعھد، جاء یوم القیامۃ لا حجۃ لہ** ''۱۴؎ ''میرے بعد ایسے امراء ہوں گے جو وقت بے وقت نماز پڑھیں گے۔ تم ان کے ساتھ نماز پڑھتے رہو۔ اگر وہ وقت پر نماز پڑھیں گے تو انہیں اور تمہیں اس کا ثواب مل جائے گا اور اگر وہ تاخیر کریں گے تو تمہیں ثواب مل جائے گا اور ان کے کیے اس کا وبال ہوگا۔ یہ اس لیے کہ جو نظمِ ریاست سے الگ ہوا اور اسی حالت میں مر گیا، وہ جاہلیت کی موت مرا اور جس نے عہد توڑا اور عہد توڑ کر مرا وہ قیامت کے دن اس طرح آئے گا کہ اس بات کے جواز میں پیش کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی حُجت نہ ہوگی۔''

یہ یقینی بات ہے کہ امیر کا مفہوم صرف جنگی قیادت کرنے والے افراد تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا احاطہ روزمرہ اُمور جیسے نماز کی اِمامت، معاشی و معاشرتی نظم وضبط، سیاسی نظم ونسق، قیدیوں اور فوجیوں کی عمومی دیکھ بھال وغیرہ پر ہے۔ سب سے اہم بات امیرِ وقت کی سیاسی بالغ نظری اور معاشرے کے لیے اُس کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ متعلقہ حدیث کے مطابق اگر کسی فرد نے ریاستی اُمور سے روگردانی کی اور امیر کی اطاعت کو ماننے سے انکار کیا تو وہ عہد شکنی کا مرتکب ہوا اور عہد شکن شخص کا دین نامکمل ہے اور وہ جہالت کی موت مرتا ہے۔ دوسری ضروری اور اہم بات نظامِ سیاست کی بقاء ہے۔ اگر اہلِ رائے حضرات کی باہمی مشاورت کے نتیجے میں کسی کی حکمرانی پر اتفاق ہوا تو پھر تمام اُمہ پر اس کی اطاعت لازمی ہوگی اگرچہ وہ حاکم کوئی حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ جیسا کہ پیغمبر اسلامؐ سے مروی ہے: ''**سمعوا و اطیعوا و ان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ** ''۱۵؎ ''سمع وطاعت پر قائم رہو، خواہ تم پر ایک حبشی غلام، جس کا سر منقے کی طرح چھوٹا سا ہو، حکمران بنا دیا جائے۔''

ایک اور حدیث میں امیر اور اُس کی اطاعت کی مزید وضاحت کی گئی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوتا ہے: ''**علیکم عبد مجدع حسیبتھا قالت اسود یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ و اطیعوا** ۔۱٦؎ اگر تمہارے اوپر ہاتھ

پاؤں کٹا کا غلام بھی امیر ہو اور وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے موافق تم کو چلانا چاہے تو اس کی اطاعت کرو اور اس کی بات سنو۔'' جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں بیان کیا کہ اسلامی نظامِ زندگی میں امیر کو مطلق حاکمیت تفویض کیے جانے کے پس پردہ قرآنی مفاہیم اور اقوالِ پیغمبر اسلامؐ کارفرما ہیں۔ البتہ یہ وضاحت کرنا مشکل ہے کہ ہر حاکمِ وقت کا انتخاب بعینہٖ اُسی طرح ہوتا ہے جس کی نشاندہی قرآن مجید نے کی ہے یا پیغمبر اسلامؐ کی احادیث میں ملتا ہے۔ تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی تاریخ کے سیاسی باب میں ہر حکمران نے اپنی حاکمیت کی بقاء کیلئے ان آیات اور اَحادیث کا سہارا ضرور لیا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مسلم معاشرے میں امیر کا انتخاب لابدی مسئلہ ہے تاہم اس بارے میں اختلاف ہے کہ اس کی نوعیت کس قسم کی ہوگی، انتخاب کا طریقہ کار کیا ہوگا، کون لوگ انتخابِ امیر کے مجاز ہوں گے۔ عام طور پر نظامِ خلافت کو زیادہ معتبر جانا جاتا ہے، اس کے طریقۂ اِنتخاب اور نوعیت کی مثالیں بھی عام دی جاتی ہیں۔ رائج الوقت نظامِ حکمرانی کی طرح اسلام میں امیر کا انتخاب یقیناً ہوتا ہے تاہم اس میں عوام کی شمولیت نہیں ہوتی۔ امیر کے انتخاب کے سلسلے میں کئی طرح کے طریقۂ کار موجود ہیں۔ ایک یہ کہ اربابِ حل وعقد فیصلہ کریں گے کہ کس شخصیت کو حاکمِ وقت بننا ہے، دوسرا یہ کہ کم سے کم چھ افراد کسی کو امیر منتخب کریں گے، جس کو جمہوریت کی بنیاد قرار دیا جاسکتا ہے۔ بعض اہلِ علم کا کہنا ہے کہ تین افراد بھی امیر کا انتخاب کر سکتے ہیں، ایک حاکم ہوگا اور دو گواہ ہوں گے۔ تیسرا نظریہ یہ ہے کہ ایک ہی شخص ایک ہی فرد کو منتخب کر سکتا ہے، اس سلسلے میں حضرت عباس کی حضرت علی کو کی گئی پیش کش کو بطور مثال بیان کی جاتی ہے۔ چوتھا یہ کہ سابقہ امام نے کسی کو اپنا ولی عہد مقرر کیا ہو۔ خلافتِ راشدہ کے بعد اسلامی تاریخ میں یہ طریقۂ کار زیادہ معروف رہا۔ ہر حاکم نے اپنے بعد اپنے خاندان میں سے ہی کسی فرد کو ولی عہد مقرر رکیا۔ یوں اسلامی تاریخ کا معروف باب جو مشاورت پر مبنی تھا، موروثیت کی طرف منتقل ہوگیا۔ [۷۱]

یہ چند اُمور ہیں جن کی طرف ہم نے ضمناً اشارہ کیا اور اس بات کی وضاحت کرنے کی کوشش کی کہ اطاعت کو مطلق رکھنے کے بجائے ضروری شرائط پر محمول کیا جانا چاہیے جن کی بنیاد پر نہ صرف اِسلامی معاشرت میں نظامِ سیاسی کی شناخت ہوجائے گی بلکہ حاکم وقت کے اختیارات، اُس کی فہم وفراست اور تدبر کا ادراک بھی ہوجائے گا۔ آج کی مسلم دُنیا میں قطع نظر اس کے کہ طرزِ معاشرت کیسا ہے، نظامِ تعلیم کس قسم کا رائج ہے یا ملکی قوانین کا نفاذ کن شقوں کے تحت ہے، جدید منظرنامے میں اسلامی ریاست اُس خطۂ اَرض کو قرار دیا جائے گا جہاں پر کم ازکم اُن تین مبادیات جن کا تذکرہ ہم نے بحث کے شروع میں کیا تھا، کا اطلاق بہرصورت ہوسکتا ہو، ہو چکا ہو یا ہونے کی گنجائش موجود ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں مبادیات اصلاً وہاں لاگو ہوسکتی ہیں جہاں پر مسلمانوں کی آبادی یا مسلم معاشرہ موجود ہے۔ غیر مسلم ریاست یا معاشرہ میں وحدانیت کی پرچھائیاں تو ہوسکتی ہیں لیکن رسالت (حضرت محمدؐ کو آخری نبی کی حیثیت سے تسلیم کرنا) کی تصدیق یا اقرار ممکن نہیں اور نہ قرآن مجید کو کلام اللہ کے طور قبول کیا جاتا ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ یہ تعداد ۴۶، ۴۸، ۵۶، ۵۷، ۵۹ بیان کی گئی ہے:

=Organization of Islamic Cooperation, June 17, 2016،

(http://www.oic-oci.org)(=http://www.arabicpaper.tripod.com/country/ Retrieved on 14 August 2014."Region: Asia-Pacific,The Future of the Global Muslim Population".Pew Research Center December 22, 2011, http://www.pewresearch.org/Drew Desilver, "World's Muslim population more widespread than you might think", Pew Research Center, Retrieved on June 7, 2013, http://www.pewresearch.org/

۲۔ اسلامی تاریخ میں مدینہ کی شہری ریاست کو مبادیات کا درجہ حاصل ہے پیغمبر اسلامؐ مطلق اختیار رکھنے کے باوجود اپنے ہم نشینوں سے مشاورت بھی کیا کرتے تھے حالانکہ حتمی فیصلے کا اختیار بھی آپؐ کو حاصل تھا لیکن اس کے باوجود حکومتی تشکیل کیلئے دیگر لوگوں سے رائے طلب کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپؐ مطلق العنان حاکم بننے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس ریاست میں امیر الاطاعت کا جذبہ بھی دیکھا گیا اور امیر کی طرف سے مشاورت کی اعلیٰ ترین مثال بھی دیکھی گئی۔ خاص طور پر جنگی معاملات میں پیغمبر اسلامؐ نے اپنے ہم نشینوں کی رائے کو پسند فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ کو تفویض کردہ احکامات و معاملات اس بات کے متقاضی تھے کہ آپؐ مطلق العنان حاکم کا کردار ادا کریں لیکن کُلی اختیار کے باوجود مشاورتی عمل کا جاری رکھا جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام نہ مطلق آمریت کی گنجائش رکھتا ہے اور نہ ہی خدائی معاملات میں بندگانِ خدا کو کلی طور پر مختار سمجھتا ہے۔ بلکہ مساویانہ عمل کی راہداری ہی سیاسی نظام کا بہترین حل گردانتا ہے۔ دوسرا اہم اور روشن ترین دور خلافتِ راشدہ کا ہے۔ اس میں امیر کی اطاعت و حاکمیت کی بہترین مثال مشاہدہ کی گئی۔ فردِ واحد کی حکمرانی کے باوجود نگہبانی کیلئے مقتدر افراد کا تقرر تھا۔ اظہارِ رائے کی آزادی جیسے نظریات وضع ہوئے۔ خلیفہ وقت کو براہِ راست عوام الناس کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا تھا۔ اس دور کو آمریت سے تشبیہ اس لئے نہیں دے سکتے کہ باہمی مشاورت کا عمل دخل تھا اور بالواسطہ عوام کی شرکت بھی موجود تھی۔ جدید اصطلاحی مفہوم میں معروف جمہوریت کی طرح اس کی وضاحت اس لئے نہیں کر سکتے کہ براہِ راست عوامی شرکت لازمی نہیں تھی۔ ایک مقتدر شوریٰ کی موجودگی میں خلافتِ راشدہ کو دوام ملا۔ لہٰذا اسلامی سیاسی نظام کو ہم نہ آمریت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی جمہوریت کی طرح قبول کر سکتے ہیں بلکہ بالواسطہ خدائی حاکمیت قرار دے کر مشاورتی عمل کو اس نظام کے اہم جزو کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔

۳۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ ماضی (سلطنت اُمیہ وعباسیہ) کے چند حکمران ایسے تھے جو اسلام کی عمومی اخلاقیات سے زیادہ ذاتی خواہشات کا خیال رکھتے تھے۔ جب کہ شراب و شباب اور موسیقی کے رَسیا کے طور پر بھی ان کی شناخت بیان کی گئی ہے۔ ہارون رشید کے دربار میں مغویوں کی ایک جماعت ہوا کرتی تھی جو انہیں گا نا سُنا کر خوش کرتی تھی اور ہارون رشید سُر میں جھوم اُٹھتے تھے۔ اسی طرح خلیفہ متوکل کے پاس چار ہزار باندیاں تھیں جو اس کے استعمال میں تھیں۔ مہدی عباسی کو باندیوں سے بڑا اُنس تھا۔ عورتوں سے متعلق بات چیت کو بڑا پسند کرتا تھا۔ گانا سنتا تھا، ان کی محفلوں میں شرابیوں کی ایک بڑی تعداد بھی ہوتی تھی۔ خود تو شراب نہیں پیتا تھا لیکن کسی کو منع بھی نہیں کرتا تھا۔ فضول خرچ بھی بہت تھا۔ حج کیلئے جاتا تھا تو برف بغداد سے لائی جاتی تھی۔ ان کے دور میں عریاں گوئی اور فحش نگاری عروج پر تھی۔ پورا ملک بشار نامی شاعر کی فحش

گوئی کا شکار تھا۔ بحوالہ: ابی الحسن علی بن الحسین بن علی المسعودی، مروج الذھب و معادن الجوھر (بیروت، المکتبۃ العصریۃ، ۲۰۰۵ء) ج ۳ ص: ۲۹۷ تا ۲۹۹۔ پروفیسر امین احمد مصری، اسلام پر کیا گزری۔ضحیٰ الاسلام/ مترجم: مولانا عمر احمد عثمانی (لاہور، دوست ایسوسی ایٹس، ۱۹۳۳ء) ص: ۱۴۸، ۱۵۳۔۔واضح رہے کہ حوالہ ہذا میں ہماری گفتگو کا محور ان حکمرانوں کی ذاتی شخصیت ہے، ان کا نظامِ حکمرانی نہیں۔بطور مجموعی اس نظام سیاسی کو اس لئے مسترد نہیں کرتے کہ وہ شخصیات اسی سیاسی نظام کا حصہ تھیں جس کے تانے بانے امیر الاطاعت جیسے عمومی حکم سے ملتے تھے اور ان حکمرانوں نے بھی اپنی سلطنت کے دوام کیلئے وقتاً فوقتاً قرآن وسنت کا سہارا لیا۔مثلاً ولید اور ان جیسے دیگر لوگوں نے بار ہا اپنے ہمنشینوں کے ذریعے یہ باور کرایا کہ امیر کا انتخاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اور ان کی اچھائی یا بُرائی، دونوں صورتوں میں عوام پر اطاعت فرض ہے۔

۴۔ جلال الدین سیوطی نے ''تاریخ الخلفاء'' کے نام سے باضابطہ ایک کتاب لکھی ہے جس میں خلافتِ راشدہ سمیت بنواُمیہ، بنوعباس اور مغرب میں قائم اُمویوں کی خلافتِ عبیدی کو بھی شامل کیا ہے اور ان خلافتوں کا تسلسل بھی خلافتِ راشدہ یا اسلامی ریاست سے جوڑا ہے''۔جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی، تاریخ الخلفاء، (بیروت، دار ابن حزم، ۱۴۲۴ھ/۲۰۰۳ء) الطبعۃ الاولیٰ، ص: ۱۸

۵۔ عبدالرحمٰن بن خلدون، مقدمہ ابن خلدون (کراچی، نفیس اکیڈمی،، ۲۰۰۱ء) ج ۱ ص: ۳۳۶

۶۔ ابوالحسن علی بن محمد الماوردی، الاحکام السلطانیہ/ مترجم: مولوی سید محمد ابراہیم (لاہور، ادارہ اسلامیات، ۱۹۸۸ء) ص: ۷

۷۔ مصری، اسلام پر کیا گزری۔ضحیٰ الاسلام، محولہ بالا، ص: ۱۶

۸۔ القرآن، ۴: ۵۹۔ثناء اللہ امرتسری، تفسیری ثنائی (لاہور، مکتبہ قدوسیہ، ۲۰۰۲ء) ج ۱ ص: ۳۰۹

۹۔ جسٹس امیر علی لکھتے ہیں: ''پانچ صدیوں تک بغداد میں یہ تصور عام تھا کہ خلیفہ وامام مامور من اللہ اور نائب رسول ہے اور یہ تصور جمہور مسلمین کی مذہبی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک تھا۔یہی وجہ ہے کہ سیاسی طور پر عباسی سلطنت کو زوال حاصل ہونے کے باوجود اُن کا مذہبی وقار بہرحال قائم تھا۔سید امیر علی، روحِ اسلام (لاہور، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۲۰۱۰ء) ص: ۲۳۰، ۲۳۳، ۲۶۱۔

۱۰۔ ابوالحسین ابن الحجاج القشیری النیشاپوری، الجامع الصحیح (لاہور، خالد احسان پبلشرز، ۲۰۰۷ء) کتاب الامارہ، باب وجوب طاعۃ الامراء، حدیث: ۴۷۴۹۔

۱۱۔ القرآن، ۴: ۵۸۔مفتی محمد شفیع، معارف القرآن (کراچی، مکتبہ معارف القرآن، ۲۰۰۸ء) ج ۲ ص: ۴۴۲

۱۲۔ القرآن، ۲۶: ۱۶۳۔۱۶۳۔مولانا ابوالکلام احمد آزاد (لاہور، ترجمان القرآن، س۔ن) ج ۳ ص: ۱۳۷

۱۳۔ ابوداوٗد سلیمان بن اشعث سجتانی، سنن ابی داوٗد (لاہور، اسلامی کتب خانہ، س۔ن) باب الحث علی طلب العلم، حدیث: ۲۴۵،

۱۴۔ ابی بکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی، المصنف، (بیروت، المجلس العلمی، ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء) ج ۲ ص: ۳۷۲

۱۵۔ محمد بن اسماعیل البخاری، الجامع الصحیح (ہند، مرکزی جمیعت اہل حدیث، ۲۰۰۴ء)، کتاب الاحکام، باب السمع الطاعۃ للامام مالم تکن معصیۃ، حدیث: ۷۱۴۲،

۱۶۔ ابوالحسین ابن الحجاج القشیری النیشاپوری، الجامع الصحیح، (لاہور، خالد احسان پبلشرز، ۲۰۰۴ء) باب: وجوب طاعۃ الامراء فی غیر معصیۃ و تحریمھا فی المعصیۃ، حدیث: ۴۷۶۲۔

۱۷۔ الماوردی، الاحکام السلطانیہ، محولہ بالا ص: ۶، ۷